بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

طارق محمود ہاشمی *

اردو نظم کا غیر وابستہ لحن اور تصوراتِ انسان

اُردو نظم کے ارتقائی سفر میں جہاں اُن شعرا کا تخلیقی سرمایہ لائقِ اہمیت ہے جو خود کو کسی خاص نظریے یا گروہ سے وابستہ کر کے ایک قافلے کا حصہ تھے تو وہاں بعض ایسے شعرا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس سفر میں قطعی طور پر علاحدہ یا قدرے الگ ہو کر چل رہے تھے۔

اِن شعرا کے کسی قافلے کا حصہ نہ بننے یا اُس سے الگ ہو جانے کے کئی ایک اسباب ہو سکتے ہیں۔مخصوص نظریے سے اختلاف یا اُس نظریے کے علمبرداروں کی راسخ العقیدگی کے باعث کچھ اہلِ قلم کی عدم قبولیت، انفرادیت پسندی یا نظریاتی وابستگی کے باوجود بعض زمانی حقائق کے باعث کسی گروہ سے الگ رہنے کا خیال۔ اِس کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ممکن ہے کہ بعض شعرا ایک ایسے وقت میں اپنی تخلیقی شناخت بناتے ہیں جب ایک نظریہ اپنی طبعی عمر پوری کرنے کو ہوتا ہے جبکہ دوسرا کوئی نظریہ ابھی پاؤں پاؤں چلتا دکھائی دیتا ہے۔لہٰذا ایسے شعرا تاریخِ ادب میں کسی مخصوص گروہ یا نسل میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔

آزاد طور پر تخلیقی سفر جاری رکھنے کا مذکورہ شعرا کو اپنی شناخت کی بقا کے سلسلے میں فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ اپنی الگ تخلیقی پہچان کا جب کہ نقصان یہ کہ بعض وہ شعرا جو تخلیقی طور پر اتنی پائیداری نہیں رکھتے تھے مگر نظریاتی وابستگی کے باعث ناقدین نے اُن پر اتنا لکھا کہ آزاد طبع تخلیق کار

طارق محمود ہاشمی

قدرے پس منظر میں چلے گئے۔

اردو تنقید کا یقیناً یہ ایک المیہ رہا ہے کہ اس نے متن سے زیادہ نظریہ یا ادبی فضا میں تخلیق کار کے بارے میں عام تاثر کو زیادہ اہمیت دی، جس سے تاریخ ادب کے مد و جزر کو سمجھنے میں آج بہت سے الجھاؤ موجود ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر الگ طور پر لکھے جانے کی ضرورت ہے۔

اُردو نظم میں جن شعرا کے تصورِ انسان پر اس وقت ذکر مقصود ہے اُن میں مجید امجد، اختر الایمان، منیر نیازی، عزیز حامد مدنی، وزیر آغا اور مصطفیٰ زیدی شامل ہیں۔

مجید امجد کی نظم میں انسان کے بارے میں جس تصور کو غالب حیثیت حاصل ہے وہ اس کے مجبورِ محض ہونے کا خیال ہے۔ انسان ایک مجبورِ محض وجود ہے، جس پر وقت کا جبر کئی ایک حوالوں سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس جبر کا تسلسل بھی کئی ایک زمانوں پر پھیلا ہوا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس جبر کے پس منظر میں قوت کون سی ہے تو مجید امجد اس سلسلے میں تقدیر یا کسی ماورائی وجود کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے بلکہ بعض زمینی حقائق کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اگرچہ صدیوں کی شکست و ریخت میں انسان کے فنائے کلی کا حصہ بن جانے پر وقت کی بے رحمی کا کرب بھی اُن کی نظموں میں کسی دستِ غیب پر طعنہ زنی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

ہاں اسی گم سم اندھیرے میں ابھی بیٹھ کر وہ راکھ چننی ہے ہمیں
راکھ ان دنیاؤں کی جو جل بجھیں راکھ جس میں لاکھ خونیں شبنمیں
زیست کی پلکوں سے ٹپ ٹپ پھوٹتی جانے کب سے، جذب ہوتی آئی ہیں
کتنی روحیں، ان زمانوں کا خمیر اپنے اشکوں میں سموتی آئی ہیں[۱]

مجید امجد کے یہ اشعار ان کے ہاں کسی حد تک وجودی سوچ کا بھی پتہ دیتے ہیں کہ انسان کو کسی بے ہودہ گڑھے پر لاچار و بے بس پھینک دیا گیا ہے جہاں وہ جبر و استبداد کے عالم میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے اور اب اس حصار سے نجات کا کوئی راستہ بھی نہیں۔ بقول تبسم کاشمیری:

انسانی وجود ایک زبردست ابتلا میں پگھل رہا ہے۔انسانی وجود اس عذاب میں پگھلا دینے والی شدت سے مختلف ٹکڑوں میں ہو کے اڑ رہا ہے، بکھر رہا ہے۔[۲]

مجید امجد کی نظمیں ''زندانی'' اور ''قیدی'' اسی صورتِ حال کی تمثالیں ہیں۔ چنانچہ انسان بعض اوقات اس ابتلا سے نجات کا راستہ سوچتا ہے۔ لیکن انسان کے پاس اتنی ہمت بھی نہیں کہ وہ جامِ زیست کو سنگِ اجل پہ پھوڑ دے۔ وہ تو زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔

مجید امجد کے نزدیک انسان، موت پر زندگی کو ترجیح اس لیے دیتا ہے کہ موت سب کچھ ختم ہو جانے کا نام ہے۔ جب کہ زندگی کچھ ہوتے رہنے کی علامت۔ اس لیے انسان زندگی گذارتا ہے کہ دنیا امکانات کا اِک ہیر پھیر ہے۔ چنانچہ انسان دکھوں سے معمور زیست کرتے ہوئے بھی دل میں ایک موہوم سی امید لیے زندہ رہتا ہے کہ:

کیا عجب ہے تیرے سینے کا شرر اک تمنائے بغل گیری کے سات
وقت کے مرگھٹ پہ باہیں کھول دے اک نرالی صبح بن جائے یہ رات[۳]

تاریک رات کے نرالی صبح میں بدل جانے کا یہ عجیب واقعہ ہو بھی جائے تو یہ خوشیاں جو اسے حاصل ہوئیں ان پر انسان کی دسترس کس حد تک ہے؟ بالآخر یہ سب کچھ اس سے چھین لیا جائے گا اور ستم کی سنگینیں انسان سے اس کی تمام تر روشنیاں واپس لے لیں گی۔ یہ وہ خوف ہے جس کی وجہ سے انسان کے دل میں امید کی صدا بھی مرگِ صدا ثابت ہوتی ہے اور اس کا انجام:

نہ کوئی سقفِ منقش، نہ کوئی چترِ حریر
نہ کوئی چادرِ گل اور نہ کوئی سایۂ تاک
بس ایک تودۂ خاک
بس ایک ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان
بس ایک اندھے گڑھے میں ہجومِ کرمکِ کور
بس ایک قبۂ گور[۴]

مجید امجد نے وقت کے استبداد کی بات محض انسان کے لیے نہیں کی، بلکہ اس جبر کا شکار تمام مظاہر قدرت ہیں۔ وقت کے اِس جبر کی تمثالیں تراشتے ہوئے جو نظمیں تخلیق کی گئی ہیں اُن میں یاسیت کے ساتھ ساتھ رجائیت کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً ''کنواں'' اور ''امروز'' میں شاعر نے جس طرح صدیوں کے عمل میں لمحۂ موجود کی سرشاری کو بیان کیا ہے اُس کے تناظر میں انسان کے

مجبورِ محض ہونے کی یاسیت کا تاثر قدرے کم ہو جاتا ہے۔

وقت کا جبر انسان کے ساتھ ساتھ تمام مظاہر کائنات کو جس طرح اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے اُس کی ایک جھلک "طلوعِ فرض" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر مجید امجد انسان کو دیگر مظاہر سے ہٹ کر اِس لیے دیکھتے ہیں کہ انسان اُن سب سے مختلف ہے۔ اُس کے اندر استعدادِ ذہنی بھی ہے اور قوتِ عمل بھی۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اُس کی یہ دونوں صلاحیتیں کہیں اور استعمال ہو رہی ہیں۔ وہ ایک باعمل وجود ہے مگر اُس کے عمل کا دائرہ کار ایک طبقے نے متعین کر دیا ہے اور وہ اس دائرے کے سفر میں آگے بڑھنے کے بجائے ایک خاص نکتے سے باہر نہیں نکل پایا۔

انسان صدیوں کے سفر میں لحۂ موجود تک اپنے فکر و عمل کو کس کے لیے استعمال میں لا رہا ہے اس کی ایک تصویر "ہڑپے کا کتبہ" میں یوں دکھائی گئی ہے:

بہتی راوی تیرے تٹ پر۔ کھیت اور پھول اور پھل
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کے چھل بل
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی، اک ہالی، اک ہل
سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان
مٹی کاٹے، مٹی چاٹے، ہل کی انی کا مان
آگ میں جلتا پنجر ہالی کاہے کو انسان
کون مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں ایسے اس کے لیکھ
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں، تین بیل ہیں دیکھ[۵]

اِس نظم میں انسان کی تصویر جس حیوان کے روپ میں دکھائی گئی ہے وہ فنا کے عمل سے کس طرح دوچار ہوتا ہے بلکہ کیا جاتا ہے، اس کے لیے مجید امجد نے ایک مسلخ کی مثال دی ہے۔ جہاں انسان نہایت بے رحمی سے فنا کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ روزانہ ہزاروں انسان اس مسلخ میں کٹ مرتے ہیں اور ان کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ ہر انسان ایک چراغ کی طرح جلتا ہے لیکن دھواں بن کر کائنات کی بے کراں وسعتوں میں کہیں کھو جاتا ہے اور پھر شہرِ ابد کے تہہ خانوں سے اس کی بو تک نہیں

آتی:

روز، اس مسلخ میں کٹتا ہے ڈھیروں گوشت
دھرتی کے اس تھال میں ڈھیروں گوشت
اور پھر یہ سب ماس
چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں
بستی بستی گلیوں اور بازاروں میں
لمبی لمبی قطاروں میں
جدا جدا تقدیروں میں
بٹتا جاتا ہے---
ہر ٹکڑے کی اپنی آنکھیں، اپنا جسم اور اپنی روح
کہنے کو تو ہر ٹکڑے کا اپنا اپنا نام بھی ہے اور اپنا اپنا دیس بھی ہے
اپنی اپنی امنگیں بھی
لیکن کچھ بھی ہو
آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟
ڈھیروں گوشت---
کھالیں، بھیجے، انتڑیاں
یہ سب خود آگاہ، جیالے لوگ
میں نے آج جنھیں اس برسوں پہلے کی تصویر میں دیکھا ہے
یہ سب جسم
جیتے ریشوں کے کس بل میں سنبھلے ہوئے یہ دھڑ
آج کہاں ہیں--- یہ سب لوگ
اب تو ان کی بو تک بھی

شہرِ ابد کے تہہ خانوں سے نہیں آتی[6]

ایک جیتی جاگتی زندگی کو شہرِ ابد کے تہہ خانوں میں کون ڈال کے آجا تا ہے۔موت سے تو انکار نہیں مگر قتل سے آنے والی موت کے فیصلے میں تقدیر سے زیادہ کسی طبقے کا ظلم شامل ہوتا ہے۔اگر اسی سوال پر غور کیا جائے کہ انسان اس قدر بے بس کیوں ہے؟ اس کی مظلومیت کا سبب کیا ہے؟ وہ کون سی تلخی ہے جس نے انسانیت کے شرف سے گرا کر انسان کو بیل بنا دیا ہے؟ مجید امجد کی نظموں کا مجموعی مطالعہ اس کا جواب بھی نہایت تلخ اور ترش دیتا ہے۔انسان کی یاسیت کا سبب تقدیر کا استبداد یا کسی خدا کا جبر نہیں ہے۔ بلکہ وہ انسان ہے جو سینۂ سنگ پر پلنے والا خدا ہے۔جس کے ہاتھ میں زمین پر رہنے والے دوسرے انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔' جو بہت ارفع شان کا مالک ہے لیکن باقی انسان اس کے لیے اچھوت ہیں کہ اس کے نزدیک قدرومنزلت کا معیار محض چمکتے ہوئے سکے ہیں۔مجید امجد کے بقول

مگراب تو یہ اونچی مٹیوں والے جلوخانوں میں بستا ہے
ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کراب ہم پہ ہنستا ہے
خدا اس کا، خدائی اس کی، ہر شے اس کی، ہم کیا ہیں؟
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرہ ہیں[7]

مجید امجد کے ہاں اعلیٰ طبقے سے نفرت کے اظہار کو اشتراکی فکر بھی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اشتراکیت میں اِس طبقے کے خلاف محض نفرت نہیں بلکہ بغاوت بھی ہے اور مجید امجد کی شاعری میں بغاوت کا عنصر بہت کم ہے۔ یہاں عقیل احمد صدیقی کی ایک دلچسپ وعجیب نکتہ دانی بھی توجہ چاہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> مجید امجد کی نظموں کو مجموعی حیثیت سے لیا جائے تو اُن کے یہاں بہتر زندگی کی خواہش تو ملتی ہے لیکن اس پر کسی ایسے نظریے کی چھاپ نہیں جسے اشتراکی کہا جا سکے بلکہ مالدار طبقے سے جو بیزاری ہے، وہ غالباً اس لیے ہے کہ انھوں نے جس لڑکی سے محبت کی اور نا کام ہوئے وہ کسی امیر گھر سے وابستہ تھی۔[8]

یہ بیان نفسیاتی ناقدین کے لیے تو کسی حد تک ایک دلچسپ انکشاف ہوسکتا ہے۔کسی شاعر

کے سماجی شعور کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔

مجید امجد کی شاعری میں انسان وقت کے جبر اور طبقاتی استبداد ہر دور کے ظلم کا شکار ہے۔کم وبیش یہی تصویر اختر الایمان کی نظموں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔اگر چہ وہ انسان کے اُس جوہر کے بارے میں نہایت پر اعتماد بھی ہیں، جس کے باعث وہ تسخیر مظاہر کی استعداد رکھتا ہے:

بولی خود سر ہوا: "ایک ذرہ ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں" موج دریا بڑھی
بولی: "میرے لیے ایک تنکا ہے تو
یوں بہا دوں گی میں"، آتشِ تند کی
اک لپٹ نے کہا: "میں جلا ڈالوں گی"
اور زمیں نے کہا: "میں نگل جاؤں گی"
میں نے چہرے سے اپنے الٹ دی نقاب
اور ہنس کر کہا "میں سلیمان ہوں
ابنِ آدم ہوں یعنی میں انسان ہوں[9]

عناصرِ کائنات کو انسان کا یہ کھرا جواب اس حقیقت کا غماز ہے کہ انسان ان سب سے طاقتور ہے۔اس کے زورِ بازو میں خدا نے وہ قوت رکھی ہے کہ وہ تمام موجودات کو زیر کر سکتا ہے۔ اگر چہ ظاہری طور پر وہ ایک ذرے یا تنکے سے بڑھ کر نظر نہیں آتا اور اس کی اس ظاہری صورت کو دیکھتے ہوئے عناصرِ کائنات ہوا، پانی، آگ اور مٹی، اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ انسان کو ختم کر دیں گے۔ حال آنکہ یہ عناصرِ کائنات اپنے طور پر الگ الگ اور تنہا ہیں۔لیکن آدمی کا وجود ان سب عناصر کا مجموعہ ہے۔اس اعتبار سے وہ ان سے بڑھ کر طاقتور ہے۔

اختر الایمان کی اس نظم میں انھوں نے انسان کو ایک زبردست قوت ثابت کیا ہے جو حوادثِ زمانہ سے گھبرانے کے بجائے ان پر خندہ زن ہے۔اس کا وجود اعتماد سے معمور ہے۔ وہ نہ صرف سیلِ زمانہ سے برسرِ پیکار ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے بلکہ اس کا رخ موڑنے کی ہمت بھی اس کے بازوں میں ہے۔مگر یہ انسان جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر لیا ہے کیا اپنی زندگی کی شبِ تاریک سحر کر سکا

ہے یا نہیں۔ اخترالایمان کی نظموں ''زندگی کے دروازے پر'' اور ''پرانی فصیل'' سے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

پا برہنہ و سراسیمہ سا اک جمِ غفیر
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعلِ بے شعلہ و دود
مضطرب ہو کے گھروں سے یہ نکل آیا ہے
جیسے اب توڑ ہی ڈالے گا یہ برسوں کا جمود
ان پپوٹوں میں یہ پتھرائی ہوئی سی آنکھیں
جن میں فردا کا کوئی خواب اجاگر ہی نہیں
کیسے ڈھونڈیں گی درزیست کہاں ڈھونڈیں گی
اِن کو وہ تشنگی شوق میسر ہی نہیں

کہیں شکلیں بسورے، کلبلاتے، رینگتے گرتے
غلاظت آشنا جھلسے ہوئے انسان کے پلے
بھٹکتے، جھنجھناتے، لوٹتے گلیوں میں آوارہ
تمناؤں میں جن کی رات دن کھینچے گئے چلے
غرض اک دور آتا ہے کبھی اک دور جاتا ہے
مگر میں وواندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں
مرے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہیں
نہ توشہ ہوں، نہ راہی ہوں نہ منزل ہوں نہ جادہ ہوں[۱۰]

گویا انسان ایک بے معنی سی کوئی چیز ہے۔ زندگی کی امنگ سے عاری، مستقبل سے بے خبر اور جذبوں سے محروم۔ انسان اور انسانیت کا مفہوم کہیں گم ہوگیا ہے۔ اخترالایمان کی یہ نظمیں کیتھلین رین کے درج ذیل جملے کا شعری اظہار ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

> In our secular society man the mortal worm is paradoxically, devoid of the only dignity which properly belongs to us, our spiritual nature.[11]

انھی خیالات کا اظہار آب جو کے دیباچے میں اخترالایمان نے بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> (میری شاعری) ایک ایسے انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو رات دن بدلی ہوئی سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدروں سے دوچار ہے۔ جو اُس معاشرے اور سماج میں زندہ ہے جسے آئیڈیل نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں عملی زندگی اور اخلاقی قدروں کا ٹکراؤ ہے۔ جہاں انسان کا ضمیر اس لیے قدم قدم پر ساتھ نہیں دے سکتا کہ زندگی ایک سمجھوتے کا نام ہے اور سماج کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی قدریں نہیں مصلحت ہے اور ضمیر کو چھوڑنا اس لیے نہیں

جا سکتا کہ اگر انسان محض حیوان ہو کر رہ گیا تو ہر اعلیٰ قدر کی نفی ہو جائے گی۔[۱۲]

مادی عہد میں انسان اب محض ایک کیڑا ہے۔ زمین کی کم تر بلکہ کمترین مخلوق۔ انسان زندہ نہیں ہے محض زندگی کا درد سہہ رہا ہے، اپنے زندہ ہونے کی سزا بھگت رہا ہے۔

زندگی کی بے لبی اُف وقت کے تاریک جال
درد بھی چھننے لگا امید بھی چھننے لگی
مجھ سے میری آرزوئے دید بھی چھننے لگی
پھر وہی تاریک ماضی پھر وہی بے کیف حال[۱۳]

اس نظم میں ''پھر'' کی تکرار اس بات کا مظہر ہے کہ کرب نے ایک تسلسل اختیار کر لیا ہے اور ہر آنے والے نئے لمحے میں اس کے لیے وہی پرانا درد موجود ہے اور وہ چیخ اٹھتا ہے کہ ''پھر وہی تاریک ماضی پھر وہی بے کیف حال''۔ عہدِ حاضر کے حوالے سے اخترالایمان سروسامان کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> آدمی جہاں بھی ہے خواہی نہ خواہی۔ گفتنی ناگفتنی ہر طرح کی قید و بند میں رہ کر گذران کرتا ہے۔ یہ گذران کوئی سوچا سمجھا ہوا فعل نہیں ایک افتاد ہے۔ جیسی پڑتی ہے جھیلتا اوٹتا ہے[۱۴]

زندگی کا یہ کرب اس عہد کی مادیت پسندی کے باعث ہے کہ انسان اپنے شکم کا جہنم بھرنے کے لیے کہاں کہاں انگاروں میں ہاتھ مارتا ہے۔ وہ ایک مشین کے پرزے کی طرح ہے اور اس کی اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ اخترالایمان کی نظم ''یہ دور'' اسی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے۔

کوئی آغاز نہ انجام نہ منزل نہ سفر
سب وہی دوست ہیں دہرائی ہوئی باتیں ہیں
چہرے اُترے ہوئے دن رات کی محنت کے سبب
سب وہی قہقہے، شکایات، مداراتیں ہیں
سب وہی بغض و حسد، رشک و رقابت، شکوے
دامِ تزویر ہے، الجھاؤ کی سوگھاتیں ہیں[۱۵]

نظم کے اختتام پر اس بے کیف فضا میں شاعر کی اپنی محبوبہ سے اچانک ملاقات ہوتی ہے۔ لیکن شاعر اس کے چہرے کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ محبوبہ کے چہرے پر کوئی نکھار نہیں ہے۔ اور

""نغمگی جسم کی، وہ لوچ سا، نشہ سا مدام"" کہیں گم ہو گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

سچ کہو تم ہی ہو ؟ آتا نہیں آنکھوں کو یقین

عہد جدید نے انسان کا چہرہ کتنا مسخ کر دیا ہے کہ وہ اپنی محبوب سے محبوب ترشے کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اخترالایمان کے ہاں فرد کی گمشدگی کا سبب عصرِ حاضر کا سماجی ڈھانچہ ہے لیکن اس سماجی تشکیل کی ذمہ داری کس پہ ہے؟ اخترالایمان کے ہاں اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ البتہ عصری انسان اور اُس کی روز مرہ مشینی زندگی کی تصویر کاری کرتے ہوئے اُس کی بے بسی اور لمحۂ آئندہ کی دہشت کو لاجواب اسلوب میں بیان کرتے ہیں:

پھر نگاہوں پہ اُمڈ آیا ہے تاریک دھواں
ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ یہ مایوس چراغ
آج ملتا نہیں افسوس پتنگوں کا نشاں
میرے سینے سے اُلجھنے لگی فریاد مری
ٹوٹ کر رہ گئی انفاس کی زنجیر گراں

توڑ ڈالے گا یہ کم بخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا[۱۶]

تاریخ کے تسلسل اور بالخصوص عصرِ حاضر میں انسان جس نوع کی زندگی گذار رہا ہے اُس کا کرب مجید امجد اور اخترالایمان نے اپنی نظموں میں اپنے اپنے اُسلوب میں پیش کیا ہے مگر انسان اس نوع کی زندگی جن خبیث قوتوں کے زیرِ اثر گذارنے پر مجبور ہے اُس کی تصویریں منیر نیازی کے ہاں قدرے مختلف انداز میں ملتی ہیں۔

منیر نیازی کی نظموں میں نہ تو کسی شہری ماحول کی تمثال ہے نہ ہی انسانی زندگی کا کوئی ایسا عکس کہ جس میں فرد کی بے بسی اور کرب کو ظاہر کیا گیا ہو۔ بلکہ جنگل کی فضا اور اس سے متعلق علامات کے ذریعے اُس خوف کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جس سے عصری انسان دوچار ہے۔ منیر نے ایک واحد متکلم کے کردار اور اُس کے باطن میں تاریک ماحول کے خوف کو اس طرح نظم کیا ہے کہ نفسِ مضمون کی تاثیر

ایک الگ پیرایۂ اظہار میں ظاہر ہوتی ہے۔

پھر گھایل چیخوں نے مل کر دہشت سی پھیلائی
رات کے عفریتوں کا لشکر مجھے ڈرانے آیا
دیکھ نہ سکنے والی شکلوں نے جی کو دہلایا
ہیبت ناک چڑیلوں نے ہنس ہنس کر تیر چلائے
سائیں سائیں کرتی ہوا نے خوف کے محل بنائے[۱۷]

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی چیتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی
اس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے
ایک بڑے سے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے
سانپوں جیسی آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے تھے[۱۸]

منیر نیازی کی درج بالا نظمیں اس کی شاعری میں تخلیق پانے والی فضا کی عکاس ہیں جس میں خوف، دہشت اور ہیبت ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔ اس قدر خاموش اور تاریک فضا میں جب کوئی آہٹ یا سرسراہٹ پردۂ سماعت سے ٹکراتی ہے تو پورا وجود لرزنے لگتا ہے اور پھر ہر طرف رات کے عفریتوں کے لشکر ڈرانے لگتے ہیں۔ ہیبت ناک چڑیلیں اپنے میلے اور لمبے دانت نکالے جسم نوچنے کو آگے بڑھتی ہیں۔ پیلے منہ اور وحشی آنکھوں میں سرخ انگارے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تنہا آدمی کا وجود خوف سے لرزاں ہو جاتا ہے۔ ہر طرف ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے ہیں۔ تنہا آدمی اپنے بچاؤ کے لیے دوڑتا ہے تو ہیبت ناک چڑیلیں ہنستی ہیں، چیختی ہیں، تنہا آدمی کو بھوت راستہ نہیں دیتے۔ اس کا ایک سہارا درخت ہے جن کی شاخوں پر بیٹھ کر وہ ان وحشی بھوتوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ مگر اس محلِ اماں کی شاخوں پر بھی گدھ آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے ہیں۔

منیر نیازی کی نظموں کا یہ ماحول محض داخلی کیفیات کا مظہر نہیں بلکہ خارج کا منظر نامہ ہے۔ منیر کی نظم میں وحشی جانور، بھوت، چڑیلیں، عفریت اور بلائیں اس کے خوف کی اُٹھتی ہوئی لہریں وہ

انسان ہیں کہ مکروہ اعمال کے باعث جن کے چہرے خوفناک عفریتوں جیسے ہوگئے ہیں۔ انسان نے زمین پر اس قدر ظلم کیا ہے اور کشت وخوں کے دریا بہائے ہیں کہ اب شرفِ انسانیت پر عزوناز کا اظہار ایک بے ہودہ کلمہ لگتا ہے۔منیر نیازی ایک تنہا شخص کی طرح اس وحشی اور پر ہول ماحول میں انسان کی آرزو کرتے ہیں۔ پھر وہ کسی برگد کے تلے کسی غار میں بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ اس وحشی ماحول میں رونق کیسے پیدا کی جائے۔ انسان کو کہاں تلاش کیا جائے پھر ایک ویراں درگاہ میں کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہے؟۔۔۔کون ہے؟۔۔۔کون ہے؟"
یوں جواب آتا رہا جیسے کوئی بے چین ہے
"کیا یہاں کوئی نہیں ہے؟"
میں نے پھر ڈر کر کہا
"کوئی ہے۔۔کوئی نہیں ہے
کوئی ہے۔۔کوئی نہیں ہے"
دیر تک ہوتا رہا[۱۹]

منیر نے انتظار حسین کے ساتھ ایک مکالمے میں ظلم کرنے والی اِن طاقتوں کو زمین پر خبیث قوتیں قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> میں چنگیز خاں کی طرح کا آدمی نہیں چاہتا۔ ایسے خدا پرست لوگ دیکھنا چاہتا ہوں جن کے یہاں احساسِ جمال اتنا ہو کہ خبیث قوتیں اُس کے رعب میں آجائیں۔۔۔ میں بھی اپنی شاعری سے ایسے ہی آدمی تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔[۲۰]

جس فرد کی تیاری کی بات منیر نیازی نے کی ہے اس کی جستجو کا سفر بھی منیر کی شاعری میں کئی ایک جگہ ملتا ہے۔مگر جس طرح شاعر نے خبیث قوتوں کی تمثالیں اپنے ایک الگ انداز میں تراشی ہیں، اسی طرح صالح اور خیر کی قوتوں کے علمبردار افراد کی تلاش کے مراحل بھی ایک مختلف پیرائے میں ملتے ہیں۔منیر کی نظمیں "ویران درگاہ میں آواز" اور "صدا بصحرا" کو اگر اس تناظر دیکھا تو یہ ایک مختلف اور منفرد معنویت کے ساتھ کھلتی ہیں:

چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگور
وہ کہتی ہے۔۔"کون؟"
میں کہتا ہوں۔۔۔"میں
کھولو یہ بھاری دروازہ
مجھ کو اندر آنے دو"
اس کے بعد اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور[۲۱]

منیر نیازی کو بھی کوشش بے سود کے بعد یقین ہوتا ہے کہ واقعی کوئی نہیں۔ وہ انسان جس کی آرزو تھی اس ماحول میں نہیں ہے۔ وہ کسی اَن دیکھی دنیا میں چلا گیا ہے اور اب شہروں میں محض وہم رہ گیا ہے، خوف رہ گیا ہے۔ ہر طرف ایک سناٹا طاری ہے۔

بت کدے میں بت بہت ہیں مسندوں پر تخت پر — وہم کی تجسیم سنگیں اب ہے اوجِ بخت پر
سیکڑوں سالوں کا پہرا مستقل اس در پہ ہے — دیو کے کچھ خوف ہیں دیوارِ شہرِ سخت پر[۲۲]

اس "شہرِ اوہام" کے مکانوں میں بے روح لوگوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔اس شہر کے مکاں:

اپنے ہی ڈر سے جڑے ہوئے ہیں
اک دوجے کے ساتھ[۲۳]

منیر نیازی شہرِاوہام کے مکانوں میں بے روح انسانوں کا دکھ بھی رکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن باہمی رویوں میں تبدیلی کی تمنا بھی رکھتے ہیں، جو اِن دکھوں کا باعث ہیں۔ یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ منیر کے ہاں برائی سے شدید نفرت کا جذبہ موجود ہے لیکن اُس کا اظہار ایک خاص دھیمے مگر پُراثر انداز میں ہوا ہے۔ وہ برائی کے خلاف کسی کھلی تبلیغ کے بجائے نیک رویوں کے حسن و جمال کا تمثال اور اس کے رنگوں کے امتزاج کے ذریعے عملِ خیر کے تسلسل پر توجہ دیتے ہیں۔ کہیں کہیں مزاحمت کا رنگ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن مجموعی طور پر وہ صالح ماحول کے لیے آرزو اور ایسے ماحول کی تشکیل کے لیے کوشاں لوگوں کے لیے دعا کا رویہ اختیار کرتے ہیں:

ایک نگر ایسا بس جائے جس میں نفرت کہیں نہ ہو — آپس میں دھوکا کرنے کی، ظلم کی طاقت کہیں نہ ہو

اس کے مکیں ہوں اورطرح کے، مسکن اورطرح کے　　　اس کی ہوائیں اورطرح کی گلشن او رطرح کے[۴۴]

انسانی زندگی میں تبدیلی کا خواب شاعروں نے دیکھا اور مختلف شعبہ ہائے علم وتحقیق نے اس خواب کی تعبیر تلاش کی۔مگر سائنسی ارتقا اور صنعتی ترقی کے ذریعے تلاش کی ہوئی تعبیر کو شاعروں نے کچھ زیادہ مستحسن نہیں سمجھا، جس کی وجہ وہ وسیع تر تباہیاں ہیں جن کا سبب سائنس بنی۔مگر اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ سائنس نے اُن بہت سے خوابوں کو بھی تعبیر بخشی جوانسانی خوشحالی کے سلسلے میں شاعروں اور دانشوروں نے دیکھے۔

اُردو نظم کے ارتقائی سفر میں عزیز حامد مدنی غالباً واحد شاعر ہیں جنھوں نے عہد حاضر میں ہونے والی سائنسی ایجادات و انکشافات کوانسان کے مستقبل کے حوالے سے بہت خوش آئند قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک انسان کائنات کے جملہ عناصر سے محو پیکار ہے۔دکھ، درداور رنج و آلام انسان کی زندگی سے وابستہ ہیں اوراب تک انسان متعدد مصائب کا شکار رہا ہے۔ہر چند کہ عہد حاضر میں انسان نے ان دکھوں سے کلی طور پر نجات حاصل نہیں کی۔لیکن اس کے ہاتھ میں ایک ایسی قوت آ گئی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے خوشحال مستقبل کے خواب دیکھ سکتا ہے۔مدنی نے سائنس کے مضرات سے بھی اعتنا کیا ہے اور وہ اس بات پر دکھ اور تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ سائنس کی سادہ سی مساوات ($E=Mc^2$) کی عملی صورت ہیروشیما کی تباہی کا باعث ہوئی لیکن یہی وہ سائنس ہے جس نے انسان کو وہ شعوروآ گہی دی کہ جس کی مدد سے اس نے زمین پر ہزاروں بیماریوں او ردکھوں کا علاج تلاش کیا ہے۔ان کے نزدیک:

> عہد حاضر میں شعرا کا اضطراب اس لیے ہے کہ شاعر مثالی خوش حالی کے خواب دیکھتا ہے اور شعر میں سب سے گہرے دکھ اور سب سے گہری سرخوشی کا انکشاف ہوتا ہے۔[۴۵]

عزیز حامد مدنی کے نزدیک جدید فکریات، مذہب اوراس کے عقائد سے انحراف نہیں ہیں۔ بلکہ عہد حاضر ایک عظیم عقلی انسانیت پرستی کا دور ہے اور سائنسی انسیت(Scientific Humanism) کی بنیادیں فلسفے کی منزلوں اور مذاہب کی اعلیٰ اقدار اور نصب العین سے الگ نہیں ہیں۔عزیز حامد مدنی

کی نظم ''روحِ عصر'' کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

روحِ عصرِ رواں ترا یہ ظہور
اک اندھیرے افق پہ صبح کا نور
تیری آمد فروغِ صبحِ حیات
حاصلِ گرمیِ دمِ آنات
دی صدا تجھ کو سیرِ عالم نے
ارتقا کی حیات ہر دم نے
گر کے کچھ زندگی سنبھلتی ہوئی
ہر نفس نقشِ نو میں ڈھلتی ہوئی
ذرے ذرے میں کاوشِ تقدیر
اور نہفتہ جہان کی تعمیر
کب سے تجھ کو پکارتی ہی رہی
زلف اپنی سنوارتی ہی رہی
کشت و خرمنِ تخیل و جوئے رواں
گرمی و خونِ بازوے دہقاں
سائنس کے خواب تاک گیت بھون
آتشِ نو کے جگمگاتے لگن
آسماں آرہا ہے سوئے زمین
اک نگینہ ہے آج روئے زمین
کیوں اٹھے اس کی تشنگی کا سوال
آبِ حیواں ہے آدمی پہ حلال[۴۶]

''کاکلِ وقت'' عزیز حامد مدنی کی ایک منظوم تمثیل ہے۔جس میں عہد رفتہ اورعہد حاضر کے لوگوں کا مکالمہ دکھایا گیا ہے۔اس تمثیل میں بھی شاعر نے عہد جدید میں انسان کے سائنسی ارتقا کو سراہا ہے اور ڈارون سمیت بیشتر سائنسدانوں کوخراج عقیدت پیش کیا ہے۔تمثیل کا اختتام نوعمر مرد کی آواز پر ہوتا ہے جو دراصل عہد حاضر کا انسان ہے۔اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

محوِ پیکار ہے آدمی
آدمی ہی نے صدیوں کی کاوش کے بعد
زخم کو ایک مرہم بنایا
ایک خفاش کی طرح لٹکی ہوئی یہ زمیں تو مہ و مہر سے کھیل میں محو ہے
اس زمیں کے اندھیرے میں گھر کر کہیں
ہار مانی بھی ہے آدمی نے
چشمِ آدم ہوئی وا
جہاں سے اشارہ کیا روشنی نے
سائنس دانوں نے ڈھونڈے ہیں سیارہ ہائے فلک سیر کے داغِ دل آج
دور بینوں کی آنکھوں میں ہے
صد ہزار آفتابوں کا اک خطِ نور
کیسے کیسے مکانوں کے نقشے مکینوں کی آنکھوں میں ہیں
سیکڑوں سال سے ایک دم خوردہ آتش قبا کائنات
ایک ژولیدہ سی زلفِ اعصار و آنات
آدمی کی نظر اس کے افکار اس کی خرد کی فسوں ساز مشاقگی سے
سنورتی رہی ہے[27]

اردو نظم کے غیر وابستہ لحن سے تعلق رکھنے والے شعرا میں وزیر آغا نے انسانی وجود کے تشخص کے سوال پر غور کرتے ہوئے فطرت اور اُس کے مظاہر کے مشاہدے کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔انسان، فطرت کا ایک حسین ترین روپ ہے اور اُس کے وجود سے فطرت کی ہمہ رنگی ظاہر ہوتی ہے۔خالقِ ارض و سما نے کائنات کے متنوع رنگوں کو اِس پیکرِ خاکی میں ڈھال دیا ہے۔

فطرت نے انسان کے وجود سے اپنا اظہار سیکھا۔انسان ہی نے فطرت کو قوتِ گویائی دی ورنہ فطرت کا ہر مظہر گونگا تھا۔ زمین پر انسان نے اپنے ہونے کا اعلان کیا تو اُس کے اردگرد کا بے

زبان ماحول بول اٹھا اور پھر ہر چیز نے اپنے ''نہ ہونے'' کی نفی کر دی۔وزیر آغا کی نظم ''نشرگاہ'' کے دو بند ملاحظہ ہوں

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
اور بے تاب پھولوں سے، ساون کے جھولوں سے
چڑیوں کی لوری سے
ہر زندہ ہستی کے سانسوں کی ڈوری سے
آواز آئی:
''مجھے اپنے 'ہونے' کا حق الیقین ہے''
عجب سلسلہ تھا
کروڑوں برس کی مسافت پہ پھیلا ہوا سارا عالم
صداؤں کی،لہروں کی اک چیختی نشرگہ بن چکا تھا
فقط اپنے ہونے کا اعلان کرتا چلا جا رہا تھا[28]

وزیر آغا کی نظم ''انسان'' میں اِسی خیال کو وسیع تر تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔نظم تین حصوں میں منقسم ہے: پہلے حصے میں انسان سے پہلے زمین کی حالت کو ایک بیاباں کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جہاں ہر طرف بگولے اڑ رہے ہیں۔کائنات چیتھڑوں میں اڑ رہی ہے۔آسماں بیمار و مضمحل ہے اور گرم لو گھاس کا چہرہ جھلسا رہی ہے۔نظم کے دوسرے حصے میں کائنات میں ہر انسان کی آمد کی تصویر کھینچی گئی ہے جب کہ آخری حصے میں زمین پر انسان کے کارناموں کا اظہار ہے:

بست و کشودِ چشم سے ہے دل کا جزر و مد — ہونٹوں کے زیر و بم سے بندھی کائنات ہے
فرصت کہاں کہ رک کے سنے تو کسی کی بات — مٹھی میں تیری سلسلۂ شش جہات ہے
ڈوبے جو آفتاب تو تیری رضا ہے یہ — پھوٹے سحر تو اس میں بھی تیرا ہی ہات ہے
اوپر فلک ہے جس کی نہایت نہیں کوئی — نیچے زمیں ہے جس پہ فقط تیری ذات ہے[29]

زمین پر انسان کے اس جاہ و مرتبہ کے اقرار کے باوجود وزیر آغا،انسان کے بارے میں

رجائی رویہ نہیں رکھتے۔ بلکہ انسان دکھ اور درد میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کائنات کی بے کراں وسعتوں میں تنہا اور اجنبیت کے شدید احساس میں مبتلا نظر آتا ہے۔ وزیر آغا کی نظم "ازل سے ابد تک" میں وہ اس اقرار کے باوجود کہ زمانے کے سارے معطر مکاتیب پر انسان کے "ہونے" کی مہریں لگی ہیں۔ وہ اجنبیت کے احساس سے باہر نہیں آتے۔ بلکہ اُن کے نزدیک انسان ایک مجرد سی شے بن گیا ہے:

عجب فیصلہ ہے!
عجب یہ سزا ہے!
ازل اور ابد کی مسافت میں جھونکے کی صورت میں اڑتا پھروں
اپنی صورت کو ترسا کروں
اپنی تجرید میں خوش رہوں
اور زندہ رہوں
اور زندہ رہوں!![۳۰]

انسان کے اس کرب اور شدید ابتلا میں شکار ہونے کا اظہار وزیر آغا کی متعدد نظموں میں ہوتا ہے۔ وہ آوازیں جو سماعت کو بھلی معلوم ہوتی تھیں اب گنگ ہو گئی ہیں اور اُن کی جگہ ان آوازوں نے لے لی ہے جن سے پردۂ سماعت تار تار اور ذہن بیزار ہو رہا ہے۔ ہر طرف ایک شور بلکہ چیخیں سنائی دیتی ہیں اور اب دنیا لاکھوں آوازوں کا ایک گہوارہ ہے:

جسم چھاتی چاپ بھی ہے اور دل دہلاتی گونج بھی ہے
اور چیخیں ۔۔تیز نکیلی چیخیں
گھائل چیتے کی سی چیخیں
وقت کے اُڑتے دامن میں اب اپنے پنجے گاڑ رہی ہے
ہر جانب اک شور بپا ہے
آوازوں کی اس برکھا میں
دل کی اب آواز کوئی سنتا ہی نہیں

اس اجڑی نگری میں کوئی رکتا ہی نہیں[۳۱]

وزیر آغا کی نظمیں "تعاقب"، "نئی پوڈ"، "سرِراہ"، "یاد"، "عفریت"، "دکھ میلے آکاش کا"، "بھوری مٹی کی تہہ کو ہٹائیں" اور "جب آنکھ میری کھلی" زندگی کے پیہم دکھ اور رنج و آلام کا مظہر ہیں۔ ان نظموں میں انسان کے دکھ اور کرب کو محض بیان نہیں کیا گیا بلکہ اس کرب کے پس منظر میں کارفرما عوامل کی نشان دہی بھی موجود ہے اور انسان کے دکھ میں مبتلا ہونے کی توجیہات بھی ملتی ہیں۔ یہ رویہ جدید نظم نگاروں کے ہاں بحیثیت مجموعی بھی نظر آتا ہے اور ہر شاعر نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس ابتلا کے اسباب کو نظم کیا ہے۔

وزیر آغا کے ہاں انسانی دکھ کی توجیہہ اُس کا فطرت سے الگ ہونا ہے۔ انسان نے ارتقا کی بہت منازل طے کر لی ہیں لیکن ترقی کرنے کے اندھے رجحان نے اُسے اُس کی اپنی حیثیت سے دور کر دیا ہے اور ترقی کرنے کے بجائے وہ ایسی پستی میں گرتا چلا گیا ہے کہ انسان اپنی لطیف ترین شکل کو کھو بیٹھا ہے۔ چنانچہ وزیر آغا ایک طرف انسان کی اس فطری زندگی کی بازیافت پر زور دیتے ہیں تو دوسری طرف اس تصنع آمیز حیات کی نفی کرتے ہیں کہ جس میں انسان، انسان نہیں رہا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے وزیر آغا کی شاعری میں بجا طور پر دو رجحانات کی طرف توجہ دلائی ہے:

> ایک رجحان تو زندگی کے ارضی مظاہر سے لطف اندوز ہونے کا ہے اور دوسرا رجحان اُن تمام مظاہر سے بے زاری و نفرت کا ہے جو زندگی کے نکھار کو مدھم کرتے ہیں یا زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہونے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔[۳۲]

وزیر آغا کی نظموں میں اُن فطری مناظر کی تمثال کاری بہت عمدہ انداز میں کی گئی ہے، جن سے انسان دوری اختیار کر چکا ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اُن کی نظمیں "نیا سال" اور "عکس" اس حوالے سے اہم نظمیں ہیں۔

وزیر آغا نے اُن عوامل کی بھی پردہ کشائی کی ہے جن سے فطرت کا حسن مجروح ہوا ہے اور انسان دکھ اور ابتلا کا شکار۔۔۔اُن کی نظم "کوہِ ندا" ملاحظہ ہو جس میں عصرِ حاضر کی میکانکی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے:

صبح سویرے
ایک لرزتی چیخ سی آواز آتی ہے
سونے والو! تم مالک کو بھول گئے ہو!!
پھر چکیلی مِل کا سائرن
ایک غلیظ ڈرانے والی تند صدا کے روپ میں ڈھل کر
دیواروں سے ٹکراتا ہے
اور گلیوں میں
تنگ اندھیرے باڑے میں کہرام مچا کر
بھیڑوں کے گلّے کو ہانک کے لے جاتا ہے
پھر انجن کی برہم سیٹی
میخ سی بن کر میرے کان میں گڑ جاتی ہے
اور شب بھر کی مُچی ہوئی اک ریل کی بوگی
اپنی کلائی انجن کے پنجے میں دے کر
چل پڑتی ہے
پھر یک دم اک سناٹا چھا جاتا ہے
اور میں گھڑی کی ظالم سوئیوں کی نک نک میں
دن کے زرد پہاڑ پہ چڑھنے لگتا ہوں[۳۳]

عصرِ حاضر کی میکانکی حیات نے انسانوں کو ''بھیڑوں کا گلّہ'' بنا دیا ہے اور وہ زمین پر اشرف المخلوقات کے بجائے حیوانوں کی طرح زندگی گذار رہا ہے۔وزیر آغا نے اس مشینی زندگی اور اس کے مضمرات کو اپنی نظموں ''چیل'' اور ''اجڑتا شہر'' میں بھی بیان کیا ہے۔وزیر آغا کے نزدیک انسان جس کرب میں مبتلا ہے اُس کا اپنا پیدا کردہ ہے۔وہ فطرت کا ایک حسین ترین روپ تھا لیکن ترقی کے زعم میں اُس نے اپنا چہرہ مسخ کر دیا ہے۔

وزیر آغا کے تصورِ انسان کے سلسلے میں اُن کی طویل نظم '' آدھی صدی کے بعد'' بہت اہم ہے جس میں شاعر نے اپنے داخلی کرب کا اظہار فطری مناظر کی ایک تمثیل کے ذریعے کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ انسان کس طرح گم ہوا ہے، اُس نے فطرت سے کس طرح گریز کیا ہے۔اور جس کرب سے وہ دوچار ہے اُس کے اسباب انسان نے کس طرح پیدا کیے ۔نظم کے آخر میں وزیر آغا نے انسان کی ذات کو فطرت کے حسین ترین روپ میں دکھایا ہے جس میں فطرت اپنے متنوع رنگوں میں جلوہ گر ہو رہی ہے اور فطرت کا ظہور بھی انسان کے وجود سے ظاہر ہو رہا ہے۔

مجھے تو فقط
اپنے ''ہونے'' کا عرفان ہے
میں تو بس اس قدر جانتا ہوں
پروں کو ہلاتی
حسیں قوس بن کر مری سمت آتی ہوئی
فاختہ
پھڑ پھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں سے اترتی نمی
اور پورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں
تیرگی کی گپھا سے نکلتا ہوا
روشنی کا جہاں
دھرتیاں، کہکشائیں، جھروکے
جھروکوں سے اطلس سے کومل بدن
سبز شبدوں کی بہتی ہوئی آب جو
اک انوکھے پُراسرار معنی کے

گھاؤ سے رِستا لہو
مسکراتے ہوئے لب
یہ سب
میرے اِفکار ہیں
میری آنکھیں ہیں
مجھ کو ہمیشہ سے تکتی رہی ہیں
سدا مجھ کو تکتی رہیں گی!![۳۴]

بیسویں صدی کے تلخ ترین انسانی تجربات نے بہت سے جدید فکری سوالات کو جنم دیا ہے اور کائنات کے مستقبل کے بارے میں کئی ایک فلسفیانہ رجحانات اور تحاریک سامنے آئی ہیں۔ بہت سے آدرشوں کا اعتبار گم ہوا ہے اور کئی ایک اعتقادات صداقت کے بجائے محض ایک مبہم سوال بن کر رہ گئے۔جدید اردو نظم کے منظر نامے پر مذکورہ رجحانات اور تحاریک کا فکری تناظر بہت واضح ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ ہماری نظم کے اب تک کے سفر نے کن شعرا کو تاریخِ شعر کا حصہ بننے کے لیے اعتبار بخشا ہے اور کون سے نام باوجود اپنے بھرپور سیاسی و سماجی ڈسکورس کے رد نہیں تو کم از کم بہت پچھلی صفوں کے شمار میں آ گئے ہیں؛ انسان کے مستقبل اور فرد کے عصری آشوب کا سوال کم وبیش ہر اہم شاعر کے ہاں موجود دکھائی دیتا ہے۔

مصطفیٰ زیدی ترقی پسند تحریک سے حرکی سطح پر تو وابستہ نہیں تھے لیکن اُن کا فکری سرمایہ رومانی رجحانات سے قطع نظر زیادہ تر اُنھی موضوعات سے متعلق ہے جو ترقی پسند تحریک کے شعرا کے ہاں نمایاں ہیں۔انسانی طبقات اور اُن میں سماجی تفاوت، جنگ کا خوف اور انسانی مستقبل کے بارے میں تشویش اور غربت وافلاس کے مسائل ایسے موضوعات اُن کی بیشتر تخلیقات کا فکری مآخذ قرار پاتے ہیں۔

مذکورہ موضوعات کے تناظر میں اُن کے تخلیقی سفر کو دیکھا جائے تو مصطفیٰ زیدی نے عہدِ حاضر کے انسانی آشوب کے حوالے سے متعدد نظموں میں اپنے تصورات کا اظہار کیا ہے۔لیکن اُن کے خیالات میں انتشار دکھائی دیتا ہے اور وہ کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہو پاتے۔وہ انسان کے ارتقا پر فخر کا

اظہار بھی کرتے ہیں لیکن دوسری طرف سائنس کو ہدفِ تنقید بھی بناتے ہیں۔انھیں اس بات پر اطمینان بھی ہوتا ہے کہ انسان توہمات کو ترک کر چکا ہے لیکن دوسری طرف وہ انسان کو حاصل ہونے والی آگہی سے بھی مضطرب ہو جاتے ہیں۔اِس کی ایک وجہ غالباً اُن کا جوش سے متاثر ہونا بھی ہے کہ جوش کے ہاں مذکورہ فکری تضادات اُن کی منظومات میں فزوں تر ہیں اور یہی موضوعی بکھراؤ مصطفیٰ زیدی کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اُن کی نظم "انسان پیدا ہوگیا" میں وہ انسان کو اُس کے زبردست ارتقا کے باعث 'میر دوجہاں' کہتے ہیں۔

آسماں گیر ہے زلفوں کا دھواں کہتے ہیں
جشن بردوش ہے فردوس رواں کہتے ہیں
آج انسان ہے میر دوجہاں کہتے ہیں

اب لچکتی نہیں کوشش سے بھی غلماں کی کمر
جل گئے حدّتِ تحقیق سے اوہام کے پَر
ابدی ہے یہ جہانِ گذراں کہتے ہیں

رہرو! آ ہی گئی منزلِ عصرِ مسعود
جن کو کل لوگ سمجھتے تھے بتانِ معبود
اب انھیں ذہن کی آوارگیاں کہتے ہیں[۳۵]

لیکن انسان نے کائنات، اُس کی ماہیت، تاریخ اور طبعیات و مابعد الطبعیات کے حوالے سے جو آگہی حاصل کی ہے اُس نے انسان کے اُس تصور کی یکسر نفی کر دی ہے کہ جس کے مطابق اس پیکرِ خاکی کا مقام کائنات کی جملہ اشیا سے بلند و برتر ہے۔نئے تصورات نے محض اُس انسانِ برتر کی نفی نہیں کی ہے بلکہ خدا سمیت ہر اُس چیز کی نفی کی ہے جس سے انسان نے تقدس وابستہ کیا ہوا تھا۔

شومئی قسمت کہ انسان اسی نفی کے بعد اپنے لیے کسی ایسے راستے کا تعین نہیں کر سکا جو اُسے منزل آشنا کرتا۔دوسرے لفظوں میں مصطفیٰ زیدی نے جسے منزلِ عصرِ مسعود کہا ہے وہ ایک ایسا نشانِ موہوم ہے جس سے انسان خود بے خبر ہے۔اب نہ تو وہ پیش قدمی کر سکتا ہے نہ مراجعت۔اُس کے

لیے راستے گم ہوگئے ہیں۔اب آفاق سے پرے منزل رکھنے والا انسان دیواروں کا پابند ہوگیا ہے۔

مجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے   میں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا
میں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا   نہ خلاؤں کا طلب گار نہ سیاروں کا

زندگی دھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے   اپنا سایہ بھی گریزاں،ترا داماں بھی خفا
رات کا روپ بھی بیزار، چراغاں بھی خفا   صبحِ یاراں بھی خفا شامِ حریفاں بھی خفا

خود کو دیکھا ہے تو اس شکل سے خوف آتا ہے   ایک مبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے
تارِ بے مایہ کسی دامنِ صد چاک میں ہے   ایک چھوٹی سی کرن مہر کے ادراک میں ہے
جاگ اے روح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے[۳۶]

انسان توہم کے دائروں سے نکل آیا ہے لیکن اپنی حقیقت سے آشنا ابھی خودنہیں ہوا۔وہ اپنے بارے میں اور کائنات میں اپنی حیثیت کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا۔وہ خود سے بیگانہ تھا اور بیگانہ ہی ہے۔اپنی ذات سے آشنائی اُسے نصیب نہیں ہوسکی۔مصطفیٰ زیدی کی نظم ''ارتقا'' میں انسان کے ذہنی ارتقا کی نفی کی گئی ہے کہ انسان نے جس قدر بھی ترقی کی ہے وہ محض فریب دماغ ہے اور انسانی عقل آج بھی تشنہ لبی کا اقرار کر رہی ہے۔نظم کے آخری بند ملاحظہ ہوں:

کس کو معلوم کہ اجداد پہ کیا کچھ گذری   خوں سے آلودہ ہیں اس راہ پہ قدموں کے نشاں
انھی راہوں سے پیمبر بھی گئے، ملحد بھی   انھی راہوں پہ بھٹکتا رہا بے بس انساں

زندگی ایک ستائے ہوئے طائر کی طرح   پھڑپھڑاتی رہی تاریخ کی زنجیروں میں
اور سقراط و فلاطون و ارسطو کا لہو   رنگ بھرتا رہا لمحات کی تصویروں میں

کون سے جال نہ ڈالے گئے ہر مرکز پر   کیا جیالے تھے کہ جو مائلِ پرواز رہے
ابدیت کے نشاں، لمحۂ نازک کے نقوش   بشریت کے لیے راز تھے اور راز رہے[۳۷]

تاریخ کا طبقاتی معنویت کے ساتھ ازسرِ نو جائزہ لینے کا رجحان متعدد جدید شعرا کا ایک فکری

حوالہ ہے۔خصوصاً ترقی پسند شعرا نے تاریخ میں رونما ہونے والے واقعات کو عصری معاملات کے پس منظر کے طور پر دیکھا۔مصطفیٰ زیدی نے بھی اپنی اس نظم میں تاریخ کے سانحاتِ تاریک پر ایک نظر ڈالی ہے لیکن اُن کی توجہ طبقاتی مسائل سے زیادہ ناقدریِ علم و حکمت کی طرف ہے۔اس کے ساتھ ساتھ علم و ہنر کے منفی استعمال پر بھی وہ اپنی بیشتر نظموں میں نوحہ کناں دکھائی دیتے ہیں۔انسان کی علمی تاریخ کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ حکمت و علم کے ذریعے انسان نے اپنی ذات سے آگاہی تو حاصل نہیں کی لیکن معاصر عہد میں سائنس کی مدد سے اس ''جوہر'' کو تلاش کر لیا ہے جو اُس کی تباہی و بربادی کا سامان کر سکے۔آج انسان کا سب سے بڑا مطالبہ امن ہے۔انسان اُس خوشبو کی بازیافت کا خواہاں ہے جس پر بارود کی بُو غالب آ گئی ہے۔انسان دیکھ رہا ہے کہ جس راستے پر اُس نے ''ارتقا'' کی منازل طے کی ہیں اُس نے زمین کی نس نس میں ایسا زہر بھر دیا ہے کہ بہت جلد وہ دن آئے گا جب زمین ایک روئی کا گولا بن کر فضاؤں میں بکھر جائے گی۔

انھیں لگتا ہے کہ اب کوئی جائے پناہ نہ رہی۔زندگیاں ایک بند جزیرے کے
مانند بن چکی ہے جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔[۳۸]

مصطفیٰ زیدی کی نظم ''میں امن چاہتا ہوں'' میں انسان کے انھی تخریبی رویوں کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔وہ کہتے ہیں:

اور اب کے وہ اسلحے بھی ہوں گے
زمین ہی کو نہیں جو گہرے سمندروں کو بھی راکھ کر دیں
اذیتیں جن کو سوچتے ہی سے آدمی کانپ اٹھے
ہزاروں بم جو لہکتے کھیتوں کو خاک کر دیں،جلا کے رکھ دیں
ہزاروں گیسیں جو آدمی کے بدن کی ہڈی گلا کے رکھ دیں
اجاڑ سنسان شاہراہوں پہ ڈگمگاتا ہوا تمدن
سڑی ہوئی آدمی کی لاشوں کے تیز بھبکوں سے جل اٹھے گا
لہو کی بھٹی میں گرم تانبے کے سرخ سکے ڈھلا کریں گے

سمندروں کی عظیم لہروں میں تارپیڈو چلا کریں گے
جنوں کے جبڑوں میں پس کے رہ جائیں گی نئی ہونہار نسلیں[۳۹]

نظم کے آخر میں زیدیؔ انسان کو اُس کے ''تیز ارتقا'' سے روکتے ہیں کہ جس کے باعث اُس کی ہونہار نسلیں تباہی سے دوچار ہو رہی ہیں۔

عہد نو کے نئے سے نئے انکشافات اور فلسفے کی خرافات نے انسان کو اُس کی حقیقت سے آگاہی دینے کے بجائے اُس کی ذات میں ایک ایسے خلا کو جنم دیا ہے کہ انسان سے اُس کا عالمِ تسکین کھو گیا ہے۔ انسان باہر کی دنیا میں تحیر آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے لیکن اپنے من میں نہیں جھانکتا۔ مصطفےٰ زیدی کے نزدیک انسان حقیقت کا ادراک اُسی وقت کر سکتا ہے جب وہ اپنے داخل میں جھانکتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو عہدِ حاضر کے آشوب کا علاج ہے۔ زیدیؔ کی نظم ''کوہِ ندا'' کا اختتام یوں ہوتا ہے:

اپنی ہی ذات میں اک کوہِ ندا رہتا ہے　　صرف اُس کوہ کے دامن میں میسر ہے نجات
آدمی ورنہ عناصر میں بکھرا رہتا ہے　　اور پھر اُن سے بھی گھبرا کے اٹھاتا ہے نظر

اپنے مذہب کی طرف، اپنے خدا کی جانب　　ایہاالنّاس چلو کوہِ ندا کی جانب[۴۰]

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے بقول:

> خوف و ہراس اور دشمن شہر میں حساس شاعر کی بے نوائی کی تصویر کشی اس سے بہتر کیا ہو سکتی تھی؟ اور پھر دشمن معاشرے سے خدا کی طرف رجوع، ایک فطری رویہ ہے۔[۴۱]

عالمِ خوف میں خدا کی پناہ طلب کرنا نہ صرف یہ کہ مصطفےٰ زیدی کے نزدیک فطری رویہ ہے بلکہ ازمنہ قدیم سے تا حال افراد، اقوام اور مختلف تحاریک کا ردِّعمل بھی یہی رہا ہے۔ مصطفےٰ زیدی ترقی پسند فکر کے مؤید تھے لیکن فرد کے عصری آشوب کے تناظر میں اُن کا فکری اور فطری روّیہ بھی اُس کوہِ ندا کی طرف مراجعت کا ہے، جو فرد کے تحیر اور سکوت کا مداوا ہے۔ وہ نہ صرف خود واپسی کا سفر اختیار کرتے ہیں بلکہ اپنے معاصر انسانوں کو بھی اُس جانب پلٹنے کی آواز دیتے ہیں۔

حوالہ جات

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد۔

۱۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد (لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۷۱۔
۲۔ تبسم کاشمیری، ''مجید امجد۔ آشوبِ زیست اور مقامی وجود کا تجربہ'' اوراق جدید نظم نمبر (جولائی، اگست ۱۹۷۷ء): ص ۳۲۸۔
۳۔ کلیات مجید امجد، ص ۱۴۲۔
۴۔ ایضاً، ص ۳۵۲۔
۵۔ ایضاً، ص ۳۳۰۔
۶۔ ایضاً، ص ۲۵۰۔
۷۔ ایضاً، ص ۳۷۰۔
۸۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم۔نظریہ اور عمل (علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء)، ص ۳۰۵۔
۹۔ اختر الایمان، سر و سامان (بمبئی: رخشندہ کتاب گھر، ۱۹۸۳ء)، ص ۲۰۱۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۵۳۔
۱۱۔ کیتھلین ریس (Kathleen Rais)، *What is Man*، (اسپ وچ: گولگنوزا پریس، ۱۹۷۹ء)، ص ۲۵۲۔
۱۲۔ سر و سامان، ص ۵۳۲۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۷۷۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۱۵۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶۔
۱۷۔ منیر نیازی، کلیاتِ منیر (لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء)، ص ۸۱۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۴۱۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۳۰۔
۲۰۔ انتظار حسین، ملاقاتیں (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۰۸۔
۲۱۔ کلیات منیر، ص ۳۰۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۵۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۳۰۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۴۰۔
۲۵۔ عزیز حامد مدنی، دشتِ امکاں (کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۶۴ء)، ص ۹۔
۲۶۔ عزیز حامد مدنی، نخلِ گماں (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۲۶۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔
۲۸۔ وزیر آغا، شام اور سائے (لاہور: جدید ناشرین، ۱۹۶۴ء)، ص ۱۹۔

۲۹۔ وزیر آغا،نزدیک (سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۰۷۔
۳۰۔ ایضاً، ص ۳۳۔
۳۱۔ شام اور سائے، ص ۴۳۔
۳۲۔ غلام حسین اظہر،وزیر آغا کی نظمیں (سرگودھا: مکتبہ اردو زبان،۱۹۷۲ء)، ص ۱۳۔
۳۳۔ وزیر آغا کی نظمیں، ص ۷۷۔
۳۴۔ وزیر آغا، آدھی صدی کے بعد (سرگودھا: مکتبہ اردو زبان ۱۹۷۹ء)، ص ۱۰۳۔
۳۵۔ مصطفیٰ زیدی، کلیات مصطفیٰ زیدی (لاہور: ماورا پبلی شرز،۱۹۹۴ء)، ص ۸۶۔
۳۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲۔
۳۷۔ ایضاً، ص ۲۴۳۔
۳۸۔ ڈاکٹر یاسمین سلطان، ''مصطفیٰ زیدی۔عصری نظم کا ایک منفرد لہجہ'' نقاط نظم نمبر (اکتوبر ۲۰۱۱ء)؛ ص ۲۹۶۔
۳۹۔ کلیات مصطفیٰ زیدی، ص ۱۸۶۔
۴۰۔ ایضاً، ۱۸۸۔
۴۱۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ،مصطفیٰ زیدی کی کہانی (لاہور: پاکستان ایجوکیشنل سائنسز،۱۹۹۹ء)، ص ۱۱۔

مآخذ

آغا،وزیر۔آدھی صدی کے بعد۔سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، ۱۹۷۹ء۔
______۔شام اور سائے۔لاہور: جدید ناشرین،۱۹۶۴ء۔
______۔نزدیک۔سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، ۱۹۷۹ء۔
اختر الایمان۔سرو ساماں۔بمبئی: رخشندہ کتاب گھر،۱۹۸۳ء۔
اظہر،غلام حسین۔وزیر آغا کی نظمیں۔سرگودھا: مکتبہ اردو زبان،۱۹۷۲ء۔
بیگ، مرزا حامد۔مصطفیٰ زیدی کی کہانی۔لاہور: پاکستان ایجوکیشنل سائنسز،۱۹۹۹ء۔
حسین ،انتظار۔ملاقاتیں۔لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۸ء۔
رئیس،کیتھلین(Kathleen Rais)۔*What is Man*۔اپس وچ: گولگنوزا پریس، ۱۹۷۹ء۔
زیدی،مصطفیٰ۔کلیات مصطفیٰ زیدی۔لاہور: ماورا پبلشرز،۱۹۹۴ء۔
سلطان،یاسمین۔''مصطفیٰ زیدی۔عصری نظم کا ایک منفرد لہجہ''۔نقاط نظم نمبر (اکتوبر ۲۰۱۱ء)۔
صدیقی،عقیل احمد۔جدید اردو نظم۔نظریہ اور عمل۔علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء۔
کاشمیری،تبسم۔''مجید امجد۔ آشوبِ زیست اور مقامی وجود کا تجربہ''۔اوراق جدید نظم نمبر (جولائی، اگست ۱۹۷۷ء)۔
نیازی،منیر۔کلیات منیر۔لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء۔
مجید امجد۔کلیاتِ مجید امجد۔لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۹ء۔
مدنی،عزیز حامد۔دشتِ امکان۔کراچی: اردو اکیڈمی،۱۹۶۲ء۔
______۔نخلِ گماں۔کراچی: مکتبہ دانیال،۱۹۸۳ء۔